سیموئیل پی ہنٹنگٹن

تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو

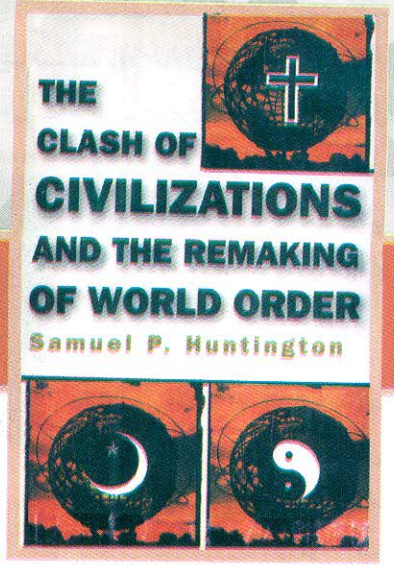

تلخیص:
محمد خالد سیف

''تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو''، "The Clash of Civilization and the Remaking of World Order" ایک مشہور کتاب ہے جو ٹچ اسٹون، نیویارک سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر، جان ایم اولن انسٹیٹیوٹ فار سٹریٹجک سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور ہارورڈ اکیڈمی فار انٹرنیشنل اینڈ ایریا سٹڈیز کے چیئرمین سیموئیل پی ہنٹنگٹن ہیں۔ وہ کارٹر انتظامیہ میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ڈائریکٹر آف سیکورٹی پلاننگ، فارن پالیسی کے بانی اور شریک مدیر اور امریکن پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گزشتہ برسوں میں شائع ہونے والی مشہور ترین اور حد درجہ متنازع کتابوں میں سے ایک ہے۔ تلخیص میں مصنف کے خیالات اور مفروضات کو کسی تبصرہ کے بغیر پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام اس حساس موضوع کے بارے میں اپنی رائے خود قائم کر سکیں۔ تلخیص میں جناب سہیل انجم کے ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جو اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا تھا جس کے لیے ہم ناشر اور مترجم دونوں کے شکر گزار ہیں۔

یہ کتاب اس مرکزی خیال کی حامل ہے کہ ثقافت اور ثقافتی شناخت، سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں اتحاد، انتشار اور تصادم پیدا کر رہی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

حصہ اول: تاریخ میں پہلی بار عالمی سیاست کثیر قطبی اور کثیر تہذیبی ہے۔ جدیدیت مغربیت سے مختلف ہے۔ یہ کسی بھی مثبت حوالے سے کسی آفاقی تہذیب کو جنم دے رہی ہے اور نہ غیر مغربی معاشروں کو مغربی بنا رہی ہے۔

حصہ دوم: تہذیبوں کے بدلتے ہوئے توازن میں، مغرب کا اثر و رسوخ نسبتاً کم ہو رہا ہے۔ ایشیائی تہذیبیں اپنی طاقت کو توسیع دے رہی ہیں، آبادی کے اعتبار سے اسلام پھیل رہا ہے، جس سے مسلمان ممالک اور ان کے ہمسایوں کے لیے عدم استحکام میں اضافہ ہو رہا ہے اور غیر مغربی تہذیبیں اپنی ثقافتوں کی اہمیت واضح کر رہی ہیں۔

حصہ سوم: تہذیبوں کی بنیاد پر ایک عالمی نظام جنم لے رہا ہے، ثقافتی تعلق رکھنے والے معاشرے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں اور معاشروں کو ایک تہذیب سے دوسری میں منتقل کرنے کی کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

حصہ چہارم: مغرب کی آفاقیت کے دعوے اسے اسلامی اور چینی تہذیب سے متصادم کر رہے ہیں، مقامی سطح پر رخنہ جنگیں، جو بیشتر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہیں، ''قرابت دار ملکوں کے گرد اجتماع''، لڑائی کے بڑھنے کے خطرے اور مرکزی ریاستوں کی جنگوں کو رکوانے کی کوششوں کا سبب ہیں۔

حصہ پنجم: مغرب کی بقاء کا انحصار اہل امریکہ کے اپنی مغربی شناخت کے دعویٰ کرنے، اہل مغرب کے تہذیب کو آفاقی نہیں، منفرد سمجھنے اور غیر مغربی معاشروں کے چیلنجوں کے خلاف اس کی تجدید اور تحفظ کے لیے متحد ہونے میں ہے اور تہذیبوں کی عالمی جنگ سے بچنے کا انحصار، دنیا کے رہنماؤں کے عالمی سیاست کے کثیر تہذیبی کردار کو قبول کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تعاون کرنے میں ہے۔

اس نئی دنیا میں سب سے زیادہ پھیلے ہوئے، اہم اور خطرناک تنازعات سماجی طبقات یا امیر و غریب گروہوں کے مابین نہیں، بلکہ مختلف ثقافتی اکائیوں میں ہوں گے۔ تہذیبوں میں قبائلی جنگیں اور نسلی تنازعے پیدا ہوتے رہیں گے مگر مختلف تہذیبوں سے وابستہ ممالک اور گروہوں میں تشدد کے واقعات میں شدت آتی رہے گی کیونکہ ان تہذیبوں سے وابستہ ممالک اور گروہ اپنے ''قرابت دار ممالک'' کی حمایت کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ واکلاف ہیول کے بقول ''ثقافتی تنازعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور تاریخ کے کسی بھی دوسرے دور کے مقابلہ میں آج زیادہ پر خطر ہیں'' اور ژاق ویلو متفق ہے کہ ''مستقبل کے تنازعات کی بنیاد اقتصادیات یا نظریات کی بجائے ثقافتی عوامل ہوں گے''۔ اور خطرناک ترین ثقافتی تنازعات تہذیبوں کے مابین رخنوں پر میں ہیں۔

مغرب تہذیبی اعتبار سے زیادہ طاقتور ہے اور برسوں تک رہے گا لیکن دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں زوال پذیر ہے۔ مغرب اپنی اقدار کے اثبات اور اپنے

مفادات کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہے، جب کہ غیر مغربی معاشرے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ بعض مغرب کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغرب کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں۔ دوسرے کنفیوشسی اور اسلامی معاشرے مغرب کی مزاحمت کرنے اور اس کے اثر کو ''متوازن'' کرنے کے لیے اپنی اقتصادی وفوجی طاقت بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست کا مرکزی محور مغربی طاقت وثقافت اور غیر مغربی طاقت وثقافت کے مابین تعامل ہے''۔

عالمگیر تہذیب کا تصور مغربی تہذیب کی مخصوص پیداوار ہے۔ انیسویں صدی میں مغرب کی ذمہ داری کے تصور نے غیر مغربی معاشروں پر مغربی سیاسی اور معاشی غلبہ کی توسیع کا جواز فراہم کیا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر عالمگیر تہذیب کا تصور دوسرے سماجوں پر مغربی ثقافتی بالادستی اور ان کے مغربی رواجوں اور اداروں کی نقالی کرنے کی ضرورت کا جواز فراہم کر رہا ہے۔ عالمگیریت غیر مغربی ثقافتوں سے محاذ آرائی کے لیے مغرب کا نظریہ ہے۔

جدید بننے سے قبل سو سال کے عرصہ میں مغربی معاشرے کی امتیازی خصوصیات کیا تھیں؟ اہل علم نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں، لیکن اہم اداروں، رواجوں اور عقائد پر جنہیں بجا طور پر مغربی تہذیب کی اساس کہا جاسکتا ہے، یہ دانشور متفق ہیں اور وہ ہیں: کلاسیکی ورثہ، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک، یورپی زبانیں، دینی ودنیوی حاکموں کی علیحدگی، قانون کی حکمرانی، سماجی تکثیریت، نمائندہ ادارے، فرد پسندی۔

بیسویں صدی میں نقل وحمل اور مواصلات کی ترقی اور عالمی باہمی انحصار کے باعث علیحدگی پسندی کی راہ اختیار کرنے والوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ۔ ڈینیل پائپس نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے ''بہت انتہا پسند بنیاد پرست ہی جدیدیت نیز مغربیت کو مسترد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیلی وژن سیٹ دریاؤں میں پھینک دیتے ہیں، کلائی کی گھڑیوں پر پابندی لگاتے ہیں اور اندرونی احتراقی انجن کو رد کر دیتے ہیں۔ اس پروگرام کے ناقابل عمل ہونے کے باعث ان گروہوں کی کشش بہت محدود ہوجاتی ہے اور بعض صورتوں میں حکام سے تشدد آمیز ٹکراؤ میں شکست کھانے کے بعد ان گروہوں کا نام ونشان مٹ گیا، جیسے سادات کے قاتل، مکہ کی مسجد کے حملہ آور اور بعض ملائیشیائی گروپ۔ نام ونشان مٹ جانا ہی عام طور پر بیسویں صدی میں خالصتاً استرداد کی پالیسیوں کی تقدیر ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں ''کٹر پن ایک قابل عمل راستہ نہیں''۔

اسلامی احیاء

اسلامی احیاء اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے اسلامی تہذیب کے مغرب سے مقابلہ کا تازہ ترین مرحلہ ہے اور مغربی نظریات کی بجائے اسلام میں ''حل'' تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں جدیدیت کو قبول کرنا، مغربی ثقافت کو رد کرنا اور جدید دنیا میں راہنمائی کے لیے اسلام سے ازسرنو وابستگی شامل ہے۔ یہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلی ہوئی ایک وسیع علمی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی تحریک ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی جسے عموماً سیاسی اسلام سمجھا جاتا ہے، اسلامی تصورات، رواجوں اور اظہار کے بڑے پیمانے پر احیاء کے طریقوں اور اسلام سے ازسرنو وابستگی کا صرف ایک جزء ہے۔

اس احیاء نے ہر مسلم ملک میں سیاست سمیت معاشرے کے بہت سے پہلوؤں کو متاثر کیا ہے۔ جان ایل ایسپوسیٹو نے لکھا ہے کہ ''ذاتی زندگی میں اسلامی بیداری کے اشاریے'' مختلف ہیں: دینی فرائض (نماز روزہ وغیرہ) کی طرف توجہ بڑھ جانا، مذہبی تقریبات ومطبوعات کا عام ہونا، اسلامی ملبوسات واقدار پر زیادہ زور، صوفی مسلک کا پھر متحرک ہوجانا۔ اس وسیع البنیاد بحالی کے ساتھ عوامی زندگی میں اسلامی رجحان والی حکومتوں، تنظیموں، قوانین، بینکوں، سماجی بہبود کی خدمات اور تعلیمی اداروں میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومتوں اور حزب اختلاف، دونوں نے اپنا اقتدار بڑھانے اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا رخ کیا ہے۔ ترکی اور تیونس جیسے سیکولر ملکوں سمیت بہت سے حکمران اور حکومتیں اسلام کی ممکنہ طاقت سے آگاہ ہو رہے ہیں اور اسلامی مسائل کے بارے میں ان کی حساسیت اور تفکرات بڑھ رہے ہیں''۔

مغربی وائرس اور ثقافتی پاگل پن

جو سیاسی رہنما یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ اپنے معاشروں میں ثقافتی اساس کو نئی شکل دے سکتے ہیں، وہ ناکام ہوں گے۔ وہ مغربی ثقافت کے کچھ عناصر متعارف کرا سکتے ہیں مگر اپنی دیسی ثقافت کے بنیادی عناصر کو خارج نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر مغربی وائرس ایک بار کسی معاشرے میں داخل ہوجائے، تو اسے نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ وائرس زندہ رہتا ہے لیکن مہلک نہیں۔ مریض بچ جاتا ہے لیکن پوری طرح صحت یاب نہیں ہوتا۔ سیاسی رہنما تاریخ بنا سکتے ہیں، مگر تاریخ سے بچ نہیں سکتے۔ وہ مقطوع مما لک پیدا کرتے ہیں، مغربی معاشرے پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ثقافتی مخبوط الحواسی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اسلام: اتحاد کے بغیر آگاہی

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشروں میں انہی عوامل نے، جنہوں نے اسلامی احیاء کو ابھارا تھا، امہ اور اسلامی تہذیب کے ساتھ شناخت کو مضبوط بنایا، جیسا کہ مسلم اتحاد کے اس احساس کی عکاسی اور حوصلہ افزائی ریاستوں اور بین الاقوامی تنظیموں کے اقدامات سے بھی ہوتی ہے۔ اسلامی آگاہی سے اسلامی اتحاد کی طرف سفر میں دو تضاد ہیں (۱) اسلام طاقت کے باہم مخالف مراکز کے درمیان بٹا ہوا ہے، سب کے سب اپنی قیادت میں اسلامی اتحاد کے فروغ کے لیے امہ کے ساتھ شناخت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (۲) امہ کے تصور میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ قومی ریاست ناجائز ہے، تاہم امہ صرف کسی ایک یا ایک سے زیادہ مرکزی ریاست کے اقدامات سے ہی متحد ہوسکتی ہے، جو فی الحال موجود نہیں۔

مسلمانوں میں داخلی وخارجی تنازعات کا بڑا سبب کسی اسلامی مرکزی ریاست کی عدم موجودگی ہے۔ اتحاد کے بغیر آگاہی اسلام کی کمزوری اور دوسری تہذیبوں کے لیے خطرے کی وجہ ہے۔ کیا یہ صورت حال جاری رہنے کا امکان ہے؟

ایران، پاکستان اور سعودی عرب نے اپنی شناخت واضح طور پر مسلم ممالک کی حیثیت سے کرائی اور امہ کو اپنے زیر اثر کرنے اور اسے قیادت فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ممالک تنظیموں کی سرپرستی کرنے، اسلامی گروپوں کو مالی امداد فراہم کرنے، افغانستان میں جنگجوؤں کی مدد کرنے اور وسط ایشیا کی اقوام کو اپنی جانب کھینچنے میں باہم مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

اسلام اور مغرب

صدر بل کلنٹن اور بعض مغربی باشندوں کا خیال ہے کہ مغرب کو اسلام سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ صرف متشدد اسلامی انتہا پسندوں سے مقابلہ ہے لیکن چودہ سو سالہ تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعلقات اکثر کشیدہ رہے ہیں، بیسویں صدی میں لبرل جمہوریت اور مارکسسٹ لینن ازم کا تنازع محض عارضی اور سطحی تاریخی واقعہ ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات مسلسل تنازع پر مبنی رہے ہیں۔ بعض اوقات پرامن بقائے باہمی کے لیے کوشش کی جاتی رہی لیکن زیادہ تر سخت شدید جنگ رہی۔ جان ایسپوسیٹو نے کہا کہ ''اپنی تاریخی حرکیات کے باعث دونوں

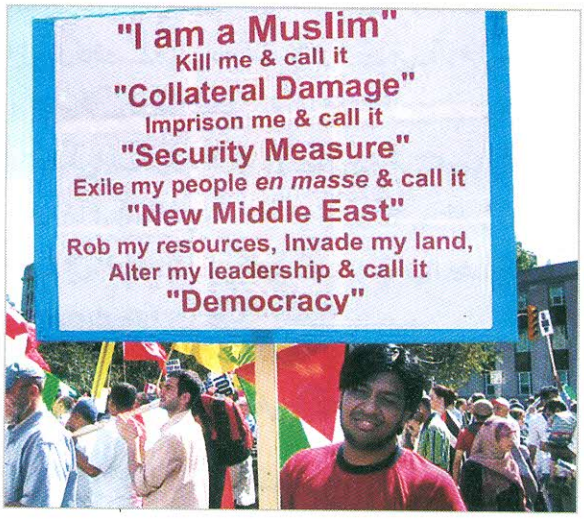

برادریوں نے خود کو طاقت، زمین اور افراد کے مسئلہ پر ایک دوسرے کے مقابل اور بعض اوقات خونریز تصادم میں نبرد آزما پایا''۔ صدیوں سے دونوں مذاہب زبردست شورشوں کے باعث عروج وزوال سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ اسلام واحد تہذیب ہے، جس نے کم از کم دو بار مغرب کی بقا کو مشکوک بنایا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں اس طرح کے عوامل نے اسلام اور مغرب کے درمیان اختلاف کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے: (۱) مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے بے روزگار نوجوانوں کی بڑی تعداد پیدا ہوئی، جو اسلام پسندانہ تحریکوں میں کام آتے، ہمسایہ معاشروں پر دباؤ ڈالتے اور مغرب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ (۲) اسلامی احیاء نے مسلمانوں کے مغرب کے مقابلہ میں اپنی تہذیب اور اقدار کے ممتاز کردار کے بارے میں اعتماد بحال کیا ہے۔ (۳) ساتھ ہی ساتھ مغرب کی اپنی اقدار اور اداروں کو عام کرنے، فوجی اور اقتصادی بالادستی برقرار رکھنے اور عالم اسلام میں مداخلت کرنے کی کوششوں نے مسلمانوں کے اندر شدید تلخی کو جنم دیا ہے۔ (۴) کمیونزم کے خاتمہ کے بعد مغرب اور اسلام، ایک مشترکہ دشمن کے منظر سے ہٹ جانے کی وجہ سے اب ایک دوسرے کو خطرہ سمجھنے لگے ہیں۔ (۵) مسلمانوں اور مغربی باشندوں میں بڑھتے ہوئے تعلقات نے دونوں کے اندر اپنی شناخت اور دوسرے سے مختلف ہونے کا نیا احساس پیدا کیا ہے۔ یعنی اسلام اور مغرب کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کے اسباب طاقت اور ثقافت کے بنیادی سوالوں میں مضمر ہیں۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں مسلمانوں کا عمومی رجحان مغرب مخالف رہا ہے۔ یہ اسلامی احیاء کا فطری نتیجہ اور مسلمان معاشروں کی ''غرب زدگی'' کے خلاف ردعمل ہے۔ اسلام کے اثبات نو کا مطلب، خواہ اس کی مخصوص فرقہ وارانہ شکل کچھ بھی ہو، مقامی سماج، سیاست اور اخلاق کی حمایت اور امریکی اثرات کی مذمت ہے۔ مسلمان مغرب کی طاقت اور اس سے اپنے معاشرے اور عقائد کو درپیش خطرے سے ڈرتے ہیں۔ وہ مغربی ثقافت کو مادہ پرست، بدعنوان، انحطاط پذیر اور اخلاق باختہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی نظروں میں مغربی سیکولرزم، لادینی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے راہ روی مغربی عیسائیت سے بدتر ہیں۔ مغرب کے خلاف ردعمل نہ صرف اسلامی احیاء کے علمی حلقوں میں نظر آتا ہے بلکہ یہ مسلمان حکومتوں کے مغرب کے بارے میں رویوں کی تبدیلی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مغرب دشمنی کے بالمقابل مغرب میں ''اسلامی خطرے'' کے بارے میں تشویش بڑھ رہی ہے، جو مسلمان انتہا پسندوں کی طرف سے ہے۔ اسلامی دنیا کو جوہری پھیلاؤ، دہشتگردی اور یورپ میں بن بلائے تارکین کا گڑھ اور مأخذ سمجھا جاتا ہے اور یہ تشویش عوام اور رہنماؤں دونوں میں پائی جاتی ہے۔

مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں، بلکہ اسلام ہے۔ ایک مختلف تہذیب، جس کے افراد کو اپنی ثقافت کی برتری اور اپنی طاقت کی کمتری کا شدید احساس ہے۔ اسلام کا مسئلہ سی آئی اے یا امریکی محکمہ دفاع نہیں، بلکہ مغرب ہے، ایک مختلف تہذیب جس کے افراد کو اپنی عالمگیر ثقافت پر یقین ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی برتر طاقت، ان پر اس ثقافت کو پوری دنیا میں پھیلانے کو فرض قرار دیتی ہے۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تنازعے کے یہی اساسی اجزاء ہیں۔

اسلام ابتداء ہی سے تلوار کا مذہب رہا ہے۔ اس میں عسکری فضائل کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اسلام ''خانہ بدوش جنگجو بدو قبائل'' کے درمیان ابھرا اور یہ پرتشدد ابتداء اسلام کی گھٹی میں پڑی ہے۔ محمد (ﷺ) خود ایک زبردست ماہر حرب اور بہترین سپہ

سالار کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ (عیسیٰ (علیہ السلام) اور گوتم بدھ کے بارے میں کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا) یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ اسلام کے عقائد منکرین سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں اور جب اسلام کی ابتدائی توسیع کا سلسلہ کم ہوا تو مسلمان گروہوں نے عقیدے کے بالکل خلاف آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ فتنوں یا داخلی تنازعات اور جہاد کا تناسب بہت زیادہ اول الذکر کے حق میں ہوگیا۔ قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کے امتناع کے بارے میں شاذ ہی احکام ہیں اور عدم تشدد کا تصور مسلم عقائد اور عمل میں موجود نہیں۔

کشمیر کی جنگ میں پاکستان نے شورش پسندوں کی کھلی سفارتی و سیاسی حمایت کی اور پاکستانی فوجی ذرائع کے مطابق پیسہ اور اسلحہ سے بھی مدد کی، نیز تربیت، نقل و حمل کی سہولتیں اور پناہ گاہ فراہم کی۔ شورش پسندوں کے لیے پاکستان نے مسلمان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ۱۹۹۵ء تک شورش پسندوں کو افغانستان، تاجکستان اور سوڈان کے کم از کم ۱۲۰۰ مجاہدین کی مدد حاصل ہو چکی تھی، جو اسٹنگر میزائل اور دیگر ایسے ہتھیاروں سے لیس تھے، جو امریکیوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں انہیں فراہم کیے تھے۔

تہذیبی جنگ اور نظام

ایسی عالمی جنگ کا امکان بہت کم ہے، جس میں دنیا کی بڑی تہذیبوں کی مرکزی ریاستیں شریک ہوں لیکن ناممکن نہیں۔ اس طرح کی جنگ مختلف تہذیبوں کے درمیان رخنہ جنگ کے پھیل جانے سے چھڑ سکتی ہے، جس میں سب سے زیادہ امکان ایک طرف مسلمانوں اور دوسری طرف غیر مسلموں کے ہونے کا ہے۔ جنگ پھیل جانے کا امکان اس صورت میں زیادہ ہوگا، جب مرکزی ریاست کی حیثیت کے امیدوار مسلم ممالک اپنے برسر پیکار ہم مذہبوں کو امداد فراہم کرنے کی کوشش کریں۔

اس عالمی تہذیبی جنگ کا فوری نتیجہ کچھ بھی ہو- باہمی جوہری بربادی، یا تھکاوٹ کی وجہ سے جنگ بندی پر اتفاق یا بالآخر تیانن مین اسکوائر میں روسی و مغربی افواج کی رسائی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگ کے تمام شرکاء کی معاشی، آبادیاتی اور فوجی طاقت میں نمایاں کمی ہو جائے گی۔ لہٰذا عالمی طاقت جو صدیوں تک مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہوتی رہی تھی اور مغرب سے مشرق کو منتقل ہونا شروع ہوگئی تھی، اب شمال سے جنوب کو منتقل ہوگی۔ تہذیبوں کی جنگ سے سب سے زیادہ فائدہ ان تہذیبوں کو پہنچتا ہے، جو اس میں شریک نہیں ہوتیں۔

مستقبل میں بڑی بین التہذیبی جنگوں سے بچنے کے لیے مرکزی ریاستوں کو دوسری تہذیبوں کے تنازعات میں مداخلت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ ایک سچائی ہے لیکن اسے بعض ممالک خصوصاً امریکہ کے لیے بلاشک وشبہ قبول کرنا مشکل ہوگا۔

اسلام اور مغرب کے چیلنج

ایک فارسی ضرب المثل کا مفہوم ہے:

''جب تک درخت کی جڑ میں پانی موجود ہے بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔''

روایتی اصولوں کے مطابق سچی سرگرمی کے منہاج پر کسی مثبت کام کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اسی میں اعلائے کلمۃ الحق اور اس کے مطابق عمل کا انتہائی مرکزی اور واضح کام شامل ہے۔ جہاں ایمان ہے وہاں مایوسی کی کوئی جگہ نہیں۔ آج بھی اگر دنیائے اسلام میں سچے دانشوروں کا ایک ایسا گروہ تشکیل دیا جاسکے جو بیک وقت روایتی بھی ہو اور جدید دُنیا سے کاملاً آگاہ بھی تو مغرب کی دعوت مبارزت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور اسلامی روایت کی روح کو اس فالج سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے جس کے باعث اس کے دست و بازو خطرے میں ہیں۔

اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اسلامی دُنیا میں اب بھی کیا کچھ بچایا جاسکتا ہے۔ یہی بات یاد رکھنا کافی ہوگا کہ مسلمانوں کی ایک غالب اکثریت اب بھی اسلامی تہذیب کو ایک زندہ حقیقت سمجھتی ہے جس میں جیتی ہے، سانس لیتی ہے اور دم دیتی ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اسلامی تہذیب حال کا حوالہ ہے، ماضی کا واقعہ نہیں۔ وہ لوگ جو اس تہذیب کو صرف ماضی کا حوالہ سمجھتے ہیں اس مختصر مگر غلغلہ خیز اقلیت کا جزو ہیں جو دُنیائے روایت میں زندہ نہیں ہیں اور جو اپنے لامرکز ہونے پر تمام مسلم معاشرے کو لامرکز قیاس کیے بیٹھے ہیں۔

سید حسین نصر